کورس: اردوتنقید وتحقیق(6482) سمسٹر: بہار، 2021ء

سطح: بی ایڈ کل نمبر: 100

سوال نمبر

سوال نمبر

سوال نمبر

سوال نمبر

سوال نمبر

ANS 01

جب بھی اردو تنقید پر گفتگو ہوگی سب سے پہلے مولانا الطاف حسین حالی کا نام لیا جائے گا کیونکہ وہ پہلے تنقید نگار ہیں جنہوں نے اردو تنقیدکے اصول مقرر کیے۔ ۱۸۹۳ء میں دیوان حالی شائع ہوا تو اس میں مصنف کا ایک طویل مضمون بھی شامل تھا۔اس مضمون میں اصول شاعری سے بحث کی گئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ شاعری کو کیسا ہونا چاہیے۔بدھ کو یہ مضمون الگ شائع ہوا اور اس نے ایک علیحدہ تصنیف کی شکل اختیار کرلی۔یہی مضمون ہے جو آج "مقدمہ شعر و شاعری" کے نام سے مشہور ہے۔

مقدمہ شعر و شاعری شائع ہوا تو چاروں طرف سے مخالفت کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔حالی کو خیالی اور ڈفالی جیسے ناموں سے پکارا گیا۔مگر زمانہ سب سے بڑا مصنف ہے۔طوفان تھما اور سنجیدگی سے حالی کے کارنامے پر غور کیا گیا تو سب کو تسلیم کرنا پڑا کہ حالی اردو کے پہلے باضابطہ تنقید نگار ہیں اور ان کی تصنیف 'مقدمہ شعروشاعری' اردو کی پہلی باضابطہ کتاب ہے۔بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اسے اردو تنقید کا پہلا نمونہ کہا اور پروفیسر آل احمد سرور نے اسے اردو شاعری کے پہلے منشور کا نام دیا۔

شعر و ادب کے بارے میں مولانا حالی کے خیالات ان کی دوسری کتابوں مثلا: یادگارغالب، حیات سعدی، اور حیات جاوید سے بھی معلوم ہوتے ہیں مگر مقدمہ شعروشاعری ان سب میں سب سے اہم ہے۔یہ دو حصوں میں تقسیم ہے پہلے حصے میں شاعری کے اصول بیان کیے گئے ہیں دوسرے حصے میں عملی تنقید ہے۔یہاں غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور ان کی اصلاح کیلئے مشورے دیے گئے ہیں۔ مولانا حالی شعر و ادب کو محض مسرت حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے اور ان کی مقصدیت کے قائل تھے۔وہ شاعری کی تاثیر سے فائدہ اٹھانے کو ضروری سمجھتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ شاعری زندگی کو بہتر بنانے میں مدد گار ہو سکتی ہے اور دنیا میں اس سے بڑے بڑے کام لیے گئے ہیں۔اپنے خیال کی تائید میں انہوں نے کئی مثالیں پیش کی ہیں۔اسی طرح حالی کے نزدیک اخلاق کی اصلاح کا شاعری سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔ حالی کے ان خیالات سے بہتوں نے سخت اختلاف کیا۔کہا گیا کہ شاعری کا کام لطف اندوزی ہے اس سے زندگی کو بہتر بنانے اور اخلاق کو سدھارنے کا کام لینا ایسا ہی ہے جیسے ہرن پر گھاس لادنا۔یہ بھی کہا گیا کہ شاعری اور مقصدیت میں کوئی بیر نہیں۔شرط یہ ہے کہ مقصد یا پیغام شعر میں اس طرح ڈھل جائے کہ پروپیگنڈا نہ لگے۔ایک فرانسیسی مفکر سارتر نے کہا کہ شاعری، موسیقی اور مصوری سے صرف لطف لیا جا سکتا ہے۔ان سے پیغمبری کا کام نہیں لیا جاسکتا۔پیغام دینے کے لیے نثر موجود ہے۔ مگر حالی نے جو کچھ کہا وہ وقت کا تقاضہ تھا۔اس وقت شاعری کا مفید و کارآمد ہونا ضروری تھا۔انہوں نے مقدمے کے سرورق پر ایک عربی قول درج کیا تھا جسکا مفہوم تھا: جدھر کو زمانہ پھرے تم بھی ادھر کو پھر جاو۔

حالی نے لفظ و معنی کی بحث بھی اٹھائی ہے۔وہ ابن خلدون کی رائے دہراتے ہیں کہ شاعری میں لفظ ہی سب کچھ ہے معنی کی زیادہ ہمیت نہیں۔ حالی اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے لفظ اور معنی دونوں کی یکساں اہمیت کا اعتراف کرتے ہیں مگر اصلیت یہ ہے کہ ان کا جھکاؤ معنی کی طرف ہے۔وہ شاعری میں پیغمبری کے قائل تھے۔ اس لیے ممکن نہ تھا کہ وہ پیغام کو زیادہ اہمیت نہ دیتے۔آج علمائے ادب اس پر متفق ہیں کہ لفظ و معنی میں وہی رشتہ ہے جو روح اور تن کے درمیان ہے۔

مقدمہ شعر و شاعری میں مولانا حالی نے واضح کیا ہے کہ تین چیزوں کے بغیر شاعری میں کمال حاصل نہیں کیا جا سکتا۔یہ ہیں: تخیل، مطالعہ کائنات اور تفحص الفاظ۔ تخیل وہ شے جسے انگریزی میں امیجینیشن کہا جاتا ہے۔حالی کا خیال ہے کہ یہ ملکہ پیدائشی ہوتا ہے۔اسے مشق سے حاصل کرنا ممکن نہیں۔ہاں اگر یہ موجود ہے تو کوشش سے اس میں اضافہ ضرور کیا جا سکتا ہے۔مشرق ومغرب کے سبھی علماء تخیل کی اہمیت کے قائل ہیں۔شبلی تخیل کو قوت اختراع کا نام دیتے ہیں۔تخیل کی سب سے مکمل تعریف کولرج نے کی ہے۔اس کے الفاظ میں یہ وہ قوت ہے جو دو مختلف چیزوں میں یکسانیت اور دو یکساں چیزوں میں اختلاف تلاش کرتی ہے۔مثلاً چاند اور انسانی چہرے میں بڑا فرق ہے مگر شاعر اپنے محبوب کو چاند کہتا ہے۔آسان زبان میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ تخیل خیال کی پرواز کا نام ہے۔اسی کے پروں سے اڑ کر جب ہم چاہتے ہیں ماضی میں جا پہنچتے ہیں اور جب چاہتے ہیں مستقبل کی سیر کرتے ہیں۔مختصر یہ کہ تخیل کے بغیر شاعری ممکن نہیں۔حالی شاعروں کو صلاح دیتے ہیں کہ تخیل کو بے لگام نہ چھوڑ دینا چاہیے۔اس پر عقل کی گرفت ضروری ہے ورنہ اس کی پرواز اتنی بلند ہوجائے گی کہ شعر کا مفہوم ہاتھ نہ آ سکے گا۔

شاعری کے لیے دوسری ضروری چیز مطالعہ کائنات!۔شاید بلکہ ہر فنکار اپنے فن کے لیے خام مواد اس کائنات سے حاصل کرتا ہے جس میں ہم سانس لیتے ہیں۔یہ کائنات اتنی وسیع اور ایسی عظیم الشان ہے کہ اس کے چھوٹے سے چھوٹے حصے کو بھی کامیابی کے ساتھ پیش کر دینا بہت مشکل ہے۔لیکن جب فنکار کسی حصے کو منتخب کرلے تو ضروری ہے کہ پیش کرنے سے پہلے اس کا بھرپور مطالعہ کرے۔جو کردار پیش کیے جا رہے ہیں ان کی نفسیات سے مکمل آگاہی حاصل کرے ورنہ اسے کامیابی حاصل نہ ہو سکے گی۔یہ ہے مطالعہ کائنات کی اہمیت۔

شاعری کے لئے تیسری شرط ہے تفحص الفاظ یعنی مناسب الفاظ کی جستجو!۔جس طرح مصور رنگوں کے بغیر تصویر نہیں بنا سکتا اسی طرح شاعر لفظوں کے بغیر شاعری نہیں کرسکتا۔مصور بہت سوچ سمجھ کر رنگوں کا انتخاب کرتا ہے اسی طرح شاعر ایک ایک لفظ کے لیے ستر ستر کنویں جھانکتا ہے،بڑی چھان پھٹک کے بعد لفظوں کو چنتا ہے اور انہیں نگینوں کی طرح شعر میں جڑ دیتا ہے۔شعر کہنے کے بعد بھی شاعر اس کی نوک پلک سنواتا رہتا ہے۔حالی نے رومی شاعر ورجل کی مثال دی ہے جو صبح کو شعر کہنے کے بعد دن بھر انہیں سنوارنے اور بہتر بنانے میں لگا رہتا تھا۔جس طرح ریچھنی اپنے بچوں کو چاٹ چاٹ کر خوبصورت بنا دیتی ہے،ورجل کی رائے میں شاعر بھی اسی طرح محنت کر کے اپنے شعروں کو آبدار بناتا ہے۔

اس کے بعد حالی ان خوبیوں کا ذکر کرتے ہیں جو دنیا کے بہترین شاعروں کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔یہ ہیں: سادگی، جوش اور اصلیت۔ان کی رائے ہے کہ شعر کو سادہ اور آسان ہونا چاہیے تاکہ سننے والے کو اسے سمجھنے میں دقت پیش نہ آئے۔ضروری ہے کہ شعر میں جو خیال پیش کیا جارہا ہے وہ سادہ ہو اس کے لئے جن الفاظ کا انتخاب کیا گیا ہے وہ بھی سادہ ہوں۔ حالی کی اس رائے سے ہمیں اختلاف ہے۔ شروع میں زندگی سادہ ہوتی ہے، زمانہ جوں جوں آگے بڑھتا ہے زندگی بھی پیچیدہ ہوتی چلی جاتی ہے۔شاعری زندگی کا آئینہ ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ سادگی سے پیچیدگی کی طرف سفر نہ کرے۔

ANS 02

تذکرہ کلاسیکی عہد میں لکھے جانے والی ایسی یادداشت ہے۔ تاریخی بیان اور وہ کتاب ہے جس میں شعرأکا حال لکھا جاتا ہے تذکرہ مذکر ہے، جمع ہے تذکرہ جات۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر لکھتے ہیں:

اُردو ادب میں تنقیدی شعور بلاشبہ اوّل روز سے موجود تھا مگر اُردو تنقید کا باضابطہ اور باقاعدہ آغاز 19ویں صدی کے آخر میں ہوا۔ اُردو تنقید کی کہانی کا پہلا تذکرے ہیں۔ جن میں بیشتر فارسی میں ہیں-18 ویں صدی تک تمام تذکرے فارسی میں لکھے گئے تاہم اُنیسویں صدی کے آغاز میں فورٹ ولیم کالج کے اثرات سے اُردو میں بھی لکھے جانے لگے۔ "

تذکرہ بیاض کی ترقی یافتہ صورت کا نام ہے۔ بیاض میں صرف منتخب اشعار ہوتے تھے جبکہ تذکرہ میں منتخب اشعار کے ساتھ خالق اشعار کے نام اور تخلص کا بھی اضافہ کر دیا گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ شعراءکے نام اور تخلص میں ابجدی اور تہجی ترتیب کو ترجیح دی گئی بعد ازاں مختصر حالات زندگی اور کلام پر مختصر تبصرے کا بھی اضافہ ہوا اور یوں تذکرہ بیاض سے مختلف اور مختصر منزلیں طے کرتا ہوا نیم تاریخی، نیم تنقیدی اور نیم سوانحی ماحول میں پرورش پانے لگا۔ وقت اور ماحول کے تقاضوں نے تذکروں پر ادبی تاریخ، تنقید اور سوانح نگاری کے گہرے اثرات مرتب کیے پھر یوں ہوا کہ اِن تین رنگوں کا مجموعہ نہ تو ادبی تاریخ کا نام پا سکا اور نہ ہی تنقید کہلا سکا اور نہ سوانح نگاری کے ضمن میں آسکا تو وہ تذکرے کے فن سے معروف ہوگیا اور شعرأکے مختصر حالاتِ زندگی، کلام پر سرسری تبصرہ اور انتخاب اشعار کو اِس فن کے عناصر ترکیبی مینشمار کیا گیا۔

تذکرہ نگاری کا بڑا مقصد قدیم شعر و ادب اور شعراءکے حالاتِ زندگی کو یکجا کیا جائے کہ یہ سرمایہ ادب اور نئی نسل کے لیے نمونہ رہے۔ تذکروں کی اہمیت کو جن لوگوں نے محسوس کیا اور جن کی کاوش اور لگن سے اُردو تذکروں پر جو کام ہوا اُن میں حافظ محمود شیرانی، سیّد محمد ایم اے، ابو اللیث صدیقی اور قاضی عبد الودود کے نام آتے ہیں۔ اِن بزرگوں کا کام تقسیم سے پہلے کا ہے تقسیم کے بعد پاکستان اور ہندوستان دونوں میں ۱۹۶۴ءتک سالنامہ نگار ’تذکروں کا تذکرہ نمبر‘ میں قابلِ ذکر کام نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ’اُردو شعراءکے تذکرے اورتذکرہ نگاری‘ کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

اردو میں ادبی تنقید و سوانح اور تاریخ نگاری کے سلسلے کا تحقیقی کام دراصل تذکروں کے سہارے آگے بڑھا ہے۔ اگر یہ تذکرے یکے بعد دیگرے سامنے نہ آجائیں تو ہم ’اُردو زبان و ادب کے قدیم ورثے‘ اِس کی نوعیت، اس کے اسالیب اور اسالیب کی ارتقائی کڑیوں سے ناواقف ہوتے۔ ہمیں یہ بھی پتہ نہ چلتا کہ ہمارے شعر و ادب کی تاریخ کتنی پرانی ہے اور اِس میں ہمارے اسلاف نے کتنی قسمتی چیزیں یادگار چھوڑیں ہیں۔“

فارسی زبان کے دستیاب تذکروں میں محمد عوفی کا ’لباب الالباب‘ ایران میں فارسی کا پہلا تذکرہ قرار دیا جاتا ہے۔ بارہ ابواب پر مشتمل دو جلدوں میں منقسم یہ تذکرہ 617 اور 618ءکے درمیان تکمیل کو پہنچا۔ ’لباب الالباب‘ کے بعد ایران اور ہندوستان میں فارسی شاعروں کی بڑی تعداد میں تذکرے لکھے گئے۔

۱۷۰۷ءمیں اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد ایک بڑی سیاسی تبدیلی واقع ہوئی جس نے تمام شعبہ ہائے زندگی کو متاثر کیا۔ مغلیہ سلطنت انگریز کے ہاتھوں منتقل ہوگی۔ اِس تبدیلی سے دیگر شعبہ زندگی کی طرح زبان و ادب کا شعبہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ فارسی جسے سرکاری زبان کا درجہ حاصل تھا، معزول حکومت کے ساتھ ہی معزول ہوگی اور فارسی کو اُردو کے لیے جگہ خالی کرنا پڑی اور پھر اُردو زبان میں بھی تذکرے لکھے جانے لگے۔

موجودہ تحقیق کے مطابق اُردو زبان میں لکھا جانے والا پہلا تذکرہ نکات الشعراءہے جس کی تکمیل ۱۱۶۵ءمیں میر تقی میر کے ہاتھوں ہوئی۔

اُردو کے معروف تذکروں کا مختصر تعارف:

نکات الشعراءاز میر تقی میر

نکات الشعرائ‘ میں ۱۰۳شعراءکے حالاتِ زندگی اور نمونہ کلام کے ساتھ شاعر کے فنی محاسن اور فکر و فلسفہ پر بھی جامع رائے دی گئی ہے۔ فرمان فتح پوری نے نکات الشعراءکے حوالے سے لکھا ہے کہ:

ریختہ کی اقسام، اُس کی خصوصیات، لب و لہجہ اور شعری محاسن وغیرہ کا اجمال اور اہم ذکر اوّل اسی تذکرے میں آیا ہے اور تذکرے کے خاتمے پر میر نے جو کچھ لکھا ہے وہ اُردو شاعری کی تنقیدی تاریخ میں اہم خیال کیا جاتا ہے۔"

تذکرہ ریختہ گویاں از سیّد فتح علی حسینی گردیزی

عربی اور فارسی کے عالم حسینی تصوف اور مذہب کے موضوعات پر بہت علم رکھتے تھے۔ اُردو میں اُن کا نام دو کتابوں ابطال الباطل اور ریختہ گویاں کی وجہ سے معروف ہوا۔

ریختہ گویاں میں ۹۷شعراءکے احوال بلحاظِ حروفِ تہجی قلمبند کیے گئے اور اُن تمام شعرأکی حد سے زیادہ تعریف کی گئی ہے جن شعرأکو 'نکات الشعرائ' میں سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

میر اور گردیزی دونوں نے تذکرے کے اختتام پر ایک ہی طرح کی عبارتیں لکھی ہیں ممکن ہے کہ ایک نے دوسرے سے فائدہ اُٹھایا ہے۔

مخزن نکات از محمد قیام الدین

قیام الدین قائم تخلص کرتے تھے۔ فارسی زبان کا یہ تذکرہ ۱۲۸شعرأکے احوال کے ساتھ تین حصوں یعنی متقدمین، متوسطین اور متاخرینِ شعرأکے عنوانات پر مشتمل ۱۱۶۸ءمیں اپنی تکمیل کو پہنچا۔

تذکرہ شعرائے اُردو از میر حسن دہلوی

تین طبقوں میں تقسیم اِس تذکرے کا مختصر سا دیباچہ ہے۔ اِس کے بعد بادشاہِ وقت شاہ عالم آفتاب کا ذکر ہے۔ اشعار کا انتخاب بہت خوبصورت ہے۔ شعراءکے حالات ردیف وار درج ہیں۔ میر نے کسی کی تنقیص یا بے جا تعریف سے گریز کرتے ہوئے بے لاگ تنقید کی ہے۔

گلشنِ بے خار از محمد مصطفی خان

یہ تذکرہ قدیم دکنی شعرأسے لے کر اُنیسویں صدی کے وسط تک تمام شعری تاریخ پر محیط ہے۔ اُردو کے دو سو سالہ سرمایہ کو اختصار کے ساتھ اپنے دامن میں سمیٹتے ہوئے ۱۸۳۴ءمیں شعراءکے مختصر حالات اور انتخاب کلام کے ساتھ مکمل ہوا۔

ریاض الصفحا از غلام ہمدانی مصحفی

تذکرہ نگار نے ۱۲۲۹ءشعرا کا نہ صرف اپنے دَور کے بلکہ اِس سے پہلے کے دَور کے شعر کا بھی ذکر بلحاظِ حروفِ تہجی کیا ہے۔ فارسی بان کا یہ تذکرہ ریختہ گو شعرا کے تذکرے کے ساتھ ۱۲۳۶ءمیں مکمل ہوا۔

گلشنِ گفتار از حمید اورنگ آبادی:

شعرأپر مشتمل ۱۱۶۵میں مکمل ہونے والے اس تذکرے کی اہمیت دو خاص سبب سے ہے۔ تذکرے میں بتایا ہے کہ شمالی ہند کی طرح دکن میں بھی تذکرہ نگاری کی رسم بارہویں صدی ہجری کے وسط میں پڑ گئی تھی۔دوسرے یہ کہ دکنی شعرأکے متعلق ایسی بہت سی معلومات ہیں جن سے شمالی ہند کے تذکرہ نگار پہلے واقف نہ ہے۔ انتخاب کلام میں متفرق اشعار کے بجائے پوری پوری غزلیں دی ہیں۔ یہ تذکرہ 'نصرتی' سے شروع ہوکر 'عزلت' کے ترجمے پر مکمل ہوتا ہے۔

تحفتہ الشعرأاز مرزا افضل بیگ قاقشال:

فارسی زبان کا یہ تذکرہ ۶۲شعرأکے تراجم کے ساتھ ۱۱۶۵ءمیں مکمل ہوا۔ اِس میں ریختہ گو اور فارسی گو دونوں شعرأشامل ہیں۔ تذکرے میں شعرأکی ترتیب میں کوئی اُصول نہیں برتا۔ شعرأکی تاریخ پیدائش اور وفات پر بھی توجہ نہیں دی گئی۔ تذکرے کے پہلے شاعر غلام حسین قادری اور آخر میں مرزا جان جاناں مظہر ہیں۔

چمنستان شعرأاز لچھمی نرائن شفیق:

عربی، فارسی اور علوم متداولہ میں مہارت رکھنے والے مصنف نے یہ تذکرہ ۱۷۶۱ءمیں مکمل کیا۔ فارسی زبان کا یہ تذکرہ ۳۱۳شعرأکے ذکر کے ساتھ بلحاظِ حروفِ ابجد مرتب ہوا۔ تذکرہ آرزو سراج خاں سے شروع ہو کر غلام سیّد غلام کے ذکر پر ختم ہوتا ہے۔

طبقات الشعرأاز قدرت اللہ شوق:

طبقات الشعرأ۱۷۷۵ءمیں چار طبقات کی تقسیم کے ساتھ ۳۱۳شعرأکی تعداد سے مکمل ہوا۔ طبقہ اوّل میں ریختہ گوئی کے موجدین، شعرائے دکن اور اُن کے بعض معاصرین کا ذکر ہے طبقہ دوم میں ایہام گو شعرأکو جگہ دی گئی ہے۔

طبقہ سوم میں شعرائے متاخرین اور بعض نو مشق شعرا مذکور ہیں۔ طبقہ چہارم میں شعرائے تازہ اور بعض تو شقان شامل ہیں۔ یہ تذکرہ امیر خسرو سے شروع ہوکر قدرت اللہ شوق کے تذکرے پر ختم ہوتا ہے۔

آبِ حیات از محمد حسین آزاد:

۱۸۸۰میں وکٹوریہ پریس لاہور سے شائع ہونے والی یہ کتاب موضوع و مواد کے لحاظ سے دیباچے کے علاوہ پانچ اَدوار میں تقسیم کی گئی ہے۔ ہر دَور اپنے عہد کی زبان بلکہ اُس زمانہ کی شان دکھاتا ہے۔ آبِ حیات میں بیک وقت تحقیق، تنقید، اسلوب اور تاریخ کی ایسی خصوصیات ہیں جو پہلے تذکروں میں نظر نہیں آتیں۔ شعرأکی زندگی اور کلام کے متعلق مفید آراءبھی ملتی ہیں۔ یہ اسلوب آبِ حیات کو قدیم تذکرہ نگاری سے الگ کرتا ہے اور جدید تنقیدی بنیاد ڈالتا ہے۔ جو آگے چل کر حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کی صورت میں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ اُردو تنقید کے ارتقاءکو سمجھنے کے لیے تذکرہ نگاری کا مطالعہ ناگزیر ہے لیکن تذکرہ نگاری کو تنقید کے دائرے میں رکھا بھی جاسکتا ہے یا نہیں ملاحظہ ہو۔ تذکرہ نگاری پر اُبھرنے والی ضرب کاریاں اور کچھ موافق و مخالف آوازیں۔

کلیم الدین احمد لکھتے ہیں:

اکثر شعرأکے کلام پر رائے زنی نہیں کی جاتی.... تذکروں میں ہر جگہ الفاظ کا سیلاب رواں ہے۔ یہ الفاظ کوئی خاص نقش دل و دماغ پر ثبت نہیں کرتے.... تذکرہ لویس تنقید کی ماہیئت، اُس کے مقصد، اُس کے صحیح پیرایہ سے بھی آشنا نہ تھے۔ اِس لیے ان تذکروں کی اہمیت صرف تاریخی ہے۔ یہ دُنیائے تنقید میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے.... عموماً ایسے اشعار چنے جاتے ہیں جو معیار پر پورا اُترتے ہیں .... تذکرہ نویسوں میں اتنی بھی ناقدانہ نظر نہ تھی کہ وہ اچھے اور برے اشعار میں تمیز کر سکیں۔“

رشید حسن خان کی رائے دیکھئے:

بیشتر مطبوعہ تذکروں کے متن پر پوری طرح اعتماد نہیں کیا جاسکتا .... تذکرے بے شمار غیر معتبر واقعات کا ’مال خانہ‘ بن گئے ہیں۔ صحت متن کے سلسلے میں اِن پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا .... بیشتر مطبوعہ تذکروں میں اشعار کے متن کا حال سب سے زیادہ مقیم ہے۔“

ابو الکلام قاسمی مشرقی شعریات اور اُردو تنقید کی روایت میں لکھتے ہیں:

تذکروں میں اکثر طرفداری سے کام لیا گیا ہے.... شعر کے محاسن میں زیادہ تر صنائع لفظی و معنوی کو اہمیت دی گئی ہے.... اکثر شعراءکے اسلوب و سلیقہ شعر کے لیے مبہم الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن سے شاعری کی حیثیت واضح نہیں ہوتی۔“

ڈاکٹر فرمان فتح پوری ناقدین کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں:

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے جدید نقادوں نے قدیم تذکروں کا بالااستیاب مطالعہ نہیں کیا .... یقینا ایسے تذکرے بھی موجود ہیں۔ جن میں شعرأکے حالات کو احتیاط سے جمع کر کے شعرا کے اَدوار قائم کرنے، ہر دَور کی خصوصیت اُجاگر کرنے، شعرأکی ولدیت اور سکونت کی نشاندہی کرنے اساتذہ و تلامذہ کے نام دینے اور اُن کے سنین وفات و پیدائش کے اندراج کرنے میں خاص اہتمام سے کام لیا

گیا ہے .... اِس طرح اگر خاص شاعر کے متعلق مختلف تذکروں کے اقتباسات جمع کریں تو ہمیں یقین ہے کہ اُس کی مکمل تصویر سامنے آجائے گی۔"

نور الحسن نقوی 'فن تنقید اُردو تنقید نگاری 'میں کہتے ہیں:

شعرائے اُردو کے تذکرے ہمارا قدیم اور بیش قیمت ادبی سرمایہ مکمل اور ہماری زبان میں تنقید کی بنیاد انھی کے ذریعے پڑی۔ اِن تذکروں میں تنقید کے جو نمونے ملتے ہیں انھیں باقاعدہ تنقید کہنا تو مشکل ہے البتہ انھیں اُردو تنقید کا پہلا نقش ضرور کہا جاسکتا ہے۔ "

ہمارے تذکرہ نگاروں کا زمانہ اٹھارہویں صدی کا ہے۔ جب اُردو اَدب جدید تنقیدی نظریات سے ناواقف تھا۔ تنقید تو تنقید اُردو نثر بھی تقریباً نہ ہونے کے برابر تھی۔ ان تذکرہ نگاروں کے سامنے کوئی تنقیدی نمونے نہ تھے۔ زبان اور شاعری دونوں اپنے ارتقائی مراحل میں تھے۔ ان حالات میں اُردو اَدب کی پرکھ کا یہی معیار ہونا تھا۔

ANS 03

رومانی تنقید رومانیت کی ادبی تحریک کے زیر اثر وجود میں آئی۔رومانیت، رومان، رومانی طرز احساس اور رومانی کرب وغیرہ جیسے اصطلاحات عام طور پر مشہور ہیں۔رومانس کے معنی الگ الگ دور میں الگ الگ لیے گئے ہیں۔۱۶۳۸ء میں رومانس بطور جھوٹی کہانی کے اور ۱۶۵۹ء میں بطور جعلی اور جھوٹی کے لیے گئے ہیں۔

اس طرح رومانیت سے مراد ایسے قصے اور کہانیاں ہیں جن میں رومانس کا عنصر بھی ہو اور جوٹھی بھی ہوں یعنی تخیل کی بنیاد پر جھوٹی اور ماورائی کہانیاں بیان کرنا ادب برائے ادب کے زمانے میں رائج تھا۔ ایسی باتیں جنھیں پڑھ کر یا سن کر لوگ کچھ دیر کے لیے حقیقت سے دور ہوجاتے تھے اور اس میں اس قدر گم ہو جاتے تھے کہ ان کو ذہنی تسکین کا باعث سمجھتے تھے۔

دراصل رومانیت کی تحریک مغرب کی دین ہے۔انگلستان میں ورڈزورتھ اور کولرج نے شاعری اور تنقید کا آغاز کیا اور انہیں کو انگریزی میں رومانیت کی ادبی تنقید اور رومانی تنقید کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ورڈزورتھ نے جن خیالات کا اظہار کیا انہیں کو اس تنقید کا بنیاد مانا گیایعنی تخیلاتی اور جذباتی باتیں جو انسان کے خوشی کا باعث ہوں انہی باتوں کو اس نے اپنی تنقید کا موضوع بنایا۔

اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسرت، حسن اور جذبات رومانیت کی آسائش قرار پائے۔رومانی تنقید نگاروں نے اپنی تنقید میں انہیں تصورات کو ڈھونڈنے کی کوشش کی کیونکہ رومانی نثر نگاروں کا ماننا تھا کہ شاعری کی بنیاد حقیقت پر نہیں بلکہ مسرت پر ہے۔

اسی لیے وہ خوشی اور ذہنی تسکین کے لیے اپنی تخلیقات پیش کرتے تھے۔اس لیے انہوں نے اعلیٰ شاعری کے لیے یہ معیار بنا دیا کہ عمدہ شاعری وہ ہے جسے ہر بار پڑھنے سے نئ طرح کی مسرت و خوشی حاصل ہو۔ رومانی تنقید نگاروں نے فنپارے میں انہیں نقاد کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ان کی نظر میں زیادہ علوم کے مطالعے سے اچھا شاعر نہیں بن سکتابلکہ ان کے خیال میں رومانی نقاد شاعر کے تخیل کی کارفرمائی کا اندازہ کرکے اس کی تنقید کرتا ہے۔اسی لئے رومانی نقاد ان تمام چیزوں کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے جس سے کسی بھی فن پارے میں خوشی کا احساس ہوتا ہو۔

رومانی تنقید اور شاعری ایک طرح سے بغاوت تھی جس نے تخلیقی سطح پر اپنا اظہار کیا۔رومانی اور رومانی طرز احساس برقرار رہ گے لیکن رومانی تنقید میں حسن، مسرت اور جذبات و احساسات پر جو زور دیا گیا تھا اس کا شدید ردعمل ہوا۔رومانی تنقید کا جمالیاتی تنقید اور ادب برائے ادب کے نظریے سے فرق کرنا بھی آسان نہیں رہا۔اسی لیے مارکسی تنقید نے ان سب کی مذمت کی۔

لیکن جہاں تک رومانی تنقید کا سوال ہے وہ زیادہ دن تک قائم نہیں رہ سکی اور اس تنقید کے حوالے سے نیاز فتح پوری،مہدی افادی،مجنوں گورکھ پوری کے نام لیے جا سکتے ہیں جنہوں نے رومانی تنقید کو پیش کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ یہ تحریک اردو میں زیادہ دن تک نہ چل سکی اور اس کے رد عمل کے طور پر دوسری تحریکیں وجود میں آئی اور اس طرح رومانی تنقید اردو ادب میں زیادہ کامیاب ثابت نہ ہو سکی۔

ANS 04

اردو ادب میں تذکرے معاصر شعراءکے کلام کو پرکھنے کی اولین معروضی کوشش ہیں۔ بعض اوقات تذکرہ نگاروں کے تعصبات ان کی فیصلو ں پر اثراانداز ہوتے ہیں اور اکثر جگہوں پر تذکرہ عربی و فارسی تنقید کی توسیع دکھائی دیتی ہے اردو میں مغربی تنقید کے اثرات قبول کرنے کا آغاز تحریکِ سرسید سے منسلک ہے۔ اور اس سلسلے میں مولانا حالی کی تصنیف کو عام طور پر جدید تنقید کا نقطہ آغاز قرار دیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کتاب میں مغربی تنقید کے حوالے جا بجا ملتے ہیں۔ مگر جدید اردو تنقید کے آغاز کا سہرا حالی کے بجائے آزاد کے سر ہے۔ جس کے ہاں پہلی بار اردو تنقید کے سلسلے میں مغرب سے متاثر ہونے کے شواہد ملتے ہیں ۔اس کے علاوہ محمد حسین آزاد قدیم اور جدید تنقید کے سنگم پر دکھائی دیتے ہیں۔ آزاد نے تنقیدی نظریات پر کوئی باقاعدہ کتاب نہیں چھوڑی لیکن اس کے تنقیدی خیالات آبِ حیات ، نیرنگ خیال ، سخندانِ فارس جیسی کتابوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے مختلف لیکچرز میں تنقید پر بالخصوص بات کی انہوں نے اپنی تنقیدی خیالات کا اظہار سب سے پہلے 15 اگست 1867ءمیں انجمنِ پنجاب کے مشاعرے میں اپنے ایک لیکچر بعنوان ”مشاعرے اور کلام ِ موزوں کے باب میں خیالات“ میں پیش کئے۔

آب حیات:۔

چونکہ ”آب حیات “ نے تذکروں کے پس منظر میں وجود پایا اس لئے ضروری ہے کہ قدیم تذکروں میں تنقیدی رویوں کا جائزہ لیاجائے قدیم تذکروں میں اول تو تنقید کا عنصر کم تھا۔ بعض تذکروں میں محض شاعر کا کلام پیش کیا جاتا اگر کسی تذکرہ نگار کا جی چاہتا تو اس پر مزید جملوں میں تنقید کرتا اور اس تنقید میں شاعرکی زبان اور اسلوب کا جائزہ لیا جاتا۔ پرانے تذکروں میں جو ہمیں تھوڑی بہت تنقید ملتی ہے وہ محض ذوقی یا وجدانی ہے۔ آب حیات میں ہمیں جو تنقید ملتی ہے وہ روایتی ہے ۔ اس میں قدیم تذکروں کا لہجہ صاف طور پر نظر آتا ہے۔ آزاد کسی شاعر کی خصوصیات کا تجزیہ کرکے اس کے مماس کی کی وضاحت نہیں کرتا۔ بلکہ تاثراتی طریقے سے وضاحت کرتا ہے۔ آب حیات ایک ایسی کتاب ِ ضروری ہے جس نے اردو ادب کی ایک بہت بڑی کمی پورا کیا۔ اب تک اردو میں شعراءکیباقاعدہ تاریخ وار تذکرہ مرتب نہیں ہوا تھا۔ پرانے انداز کے تذکرے تو بہت تھے لےکن اکثر نا تمام اور ناقص کوئی عہدوار تاریخ موجود نہ تھی۔

اب ایک ایسی کتاب کی ضرورت تھی جس میں شعراءکے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کئی گئی ہوں جدید انداز میں تنقید بھی ہو اور تحقیق پر مبنی سیر حاصل اور مستند حالات بھی ہوں یہ کمی آب حیات نے پوری کردی ۔ آب حیات محض شاعری کی تاریخ نہیں بلکہ توانا متحرک اور زندگی سے لبریز دستاویز بھی ہے۔ جو عہدِ ماضی کو ازسرنو زندہ کرکے ہمارے آنکھوں کے سامنے لاکھڑا کرتی ہے۔ آب حیات پرانی محبتوں اور وفاداریوں کی لافانی یادگار ہے۔ آزاد نے خود محسوس کیا کہ قدیم تذکرے عہد جدید کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے موزوں نہیں ہے اور اس سلسلے میں وہ خود لکھتے ہیں۔

” مجھ پرواجب تھا کہ جو حالات ان بزرگوں کے معلوم ہیں یا متفرق تذکروں میں متفرق مزکور ہیں انھیں جمع کرکے ایک جگہ لکھوں اور جہاں تک ممکن ہواس طرح لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی چلتی پھرتی تصویریں سامنے آن کھڑی ہوں اور انھےں حیاتِ جاودانی حاصل ہو۔“

فہرست مضامین:۔

آب ِ حیات میں سب سے پہلے ”لسانیات“ کے زمرے میں اردو زبان کے ماخذ پر توجہ دی گئی پھر عہد بہ عہد شعراءکا تذکرہ ملتا ہے۔ اس طرح ان کے مطالب کی فہرست یوں ہے۔ دیباچے میں اردو زبان کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دراصل یہ غلطی ہمارے آج کے ناقدین بھی کرتے ہیں کہ تاریخ ادب مرتب کرتے وقت تاریخ زبان لکھنا شروع کر دیتے ہیں تاریخ ادب اورچیز ہے اور لسانی تاریخ اور

چیز ۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر احسن فاروقی اپنی کتاب "اردو تنقید" میں آزاد پر پہلا اعتراض یہی کرتے ہیں کہ وہ اردو شعراءکی تاریخ مرتب کر رہے تھے نہ کہ اردو زبان کی تاریخ ۔

بہر طور آزاد نے زبان کے سلسلے میں جن نظریات کا اعتبار کیا وہ بھی کم اہمیت کے حامل نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے برج بھاشا پر فارسی نے اثر کیااور یہ زبان وجود میں آئی۔ اس کے علاوہ دو قوموں کے ملنے سے زبانوں میں کیا تبدیلیاں آتی ہیں اس کا تفصیلاً جائزہ لیا گیا ہے۔

نظم اردو کے عنوان سے مختلف ادوار کی تقسیم کی گئی ہے۔ اور ہر دور کے شاعر کو تاریخی لحاظ سے جگہ دی گئی ہے۔

پہلا دور۔

تمہید۔ولی۔ شاہِ آبرو۔مضمون۔ ناجی ۔ احسن۔ یکرنگ۔ قدما ءکے اوضاع و لباس

دوسرا دور۔

تمہید۔شاہ حاتم۔خان آرزو۔ فغاں

تیسرا دور۔

تمہید۔مرزا جانِ جاناں مظہر۔ تاباں ۔ سید انشاء(ملاقات)۔سودا۔خواجہ میر درد۔میر سوز۔ میر تقی میر

چوتھا دور۔

تمہید۔جرات ۔ سید انشاء۔ مصحفی

پانچواں دور۔

تمہید ۔ ناسخ۔ آتش۔ شاہ نصیر۔ ذوق۔ غالب ۔ مومن۔ دبیر ۔ انیس

ابتدائی اشاعت کے بعد آزاد نے اس تفصیل میں مزید اضافے کئے۔ بالخصوص مومن اور غالب کے بارے میں بہت زیادہ معلومات پیش کیں۔ مومن کو آزاد نے ابتدائی فہرست میں شامل نہیں کیا تھا۔ محمد حسین آزاد خود شیعہ مسلک سے تھے اس لئے ان پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہوئی کہ انہوں نے مومن کوجو سُنی مسلک سے تعلق رکھتے تھے کے سلسلے میں تعصب برتا۔ آزاد نے مومن کی کمی دوسرے ایڈیشن مطبوعہ 1883ءمیں پوری کردی۔ اولین اشاعت میں انہیں شامل نہ کرنے کہ وجہ یہ بتائی کہ وہ اس عہد کے شعراءمیں موزوں نہ تھے۔ اس کے علاوہ مومن کے متعلق مواد بروقت دستیاب نہ تھا۔ وجہ چاہے جو بھی ہو اس کی جو وجہ آزاد پر اعتراض کرنے والوں نے بتائی ہرگز نہیں ہو سکتی کیونکہ آزاد نے اپنی دوسری کتاب "شہرتِ عام اور بقائے دوام " میں مومن کو جرات اور ناسخ کے دوش بدوش جگہ دی ہے۔

آب حیات تذکروں سے آگے:۔

آب حیات سے پہلے تذکرے اپنے عہد کے اندر کھڑے تھے جبکہ آب حیات ، متعدد زمانوں پر محیط ہے اور بڑے ڈرامائی اور تمثیلی انداز میں بدلتے ہوئے ادبی منظر نامے کی عکاسی کرتی ہے۔ کلیم الدین احمد نے آب حیات کو تذکر ہ کہہ کر محض چونکانے کی کوشش کی ہے حقیقت یہ ہے کہ آبِ حیات تاریخی تنقید کا ایک نمونہ ہے چونکہ آزاد کے عہد میں تنقید کا تاریخی پہلو مغربی ادب میں بھی رائج تھا اس لئے یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ حالی کے مقابلے میں آزاد مغربی تنقید کی تاریخی جہت سے زیاد ہ واقفیت رکھتے تھے۔

کتاب کا پہلا حصہ جس میں اردو زبان کی نشونما اور بتدریجِ ارتقاءکا ذکر ہے نہایت عالمانہ ہے۔ آزاد پہلے شخص تھے جنہوں نے اس میدان میں قدم رکھا اس کے باوجود کہ اس کے پاس مواد کم تھا ۔ اس مہم میں اس کو کامیابی حاصل ہوئی ۔ لسانیات کے بارے میں معلومات انگریزی کتابوں سے حاصل کی گئی ہیں۔ اور جو مثالیں درج کی گئی ہیں وہ آزاد کی ذہنی دریافت ہیں۔ اور ان کے اردو اور

ہندی مطالعے کا پتہ دیتی ہیں۔ برج بھاشا کے افکار ذخیرہ الفاظ اور گرامر پر فارسی کا جائزہ بھی قابلِ غور ہے۔ یہاں وہ ایک محقق کے روپ میں سامنے آتے ہیں ۔ کتاب کے دوسرے حصے میں ان کے تنقید میں بھی ان کا انداز وہی ہے۔ جو تحقیق میں نظرآتا ہے۔

آب حیات کے تنقید ی مباحث:۔

انہوں نے شعراءکے بارے میں جو رائے دی ہے وہ نہایت پر مغز ہے اور بعد کی تنقید پر ان کا اثر دیکھا جا سکتا ہے ۔ وہ کبھی کبھی جذبات کے رو میں بہہ جاتے ہیں۔ " جیسا کہ ذوق کے سلسلے میں ، لیکن ایک بار جب سنجیدہ تنقید پر کمر بستہ ہو جاتے ہے تو اپنی ساری بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی بھو ل جاتے ہیں اور سنجیدگی سے ادبی اقدار کے فہم و شعور کا ثبوت دیتے ہیں۔ مثلاً تشبیہ ، استعارہ ، فصاحت و بلاغت اور مضمون وغیرہ کے بارے میں آزاد شاعروں پر تنقید کرتے ہوئے تحقیق کے عادی نہیں بلکہ اپنے ذوق اور پسند کو معیار بنا کر چند جملوں میں اپنی رائے دیتے ہیں مثلاً میر تقی میر کی شاعری کے بارے میں ان کی یہ رائے ہے۔

' ' میر صاحب کی زبان شستہ ، کلام صاف، بیان ایسا پاکیزہ جیسے باتیں کرتے ہیں دل کے خیالات کو جو کہ سب کے طبیعتوں کے مطابق ہیں محاورے کا رنگ دیگر باتوں باتوں میں اد ا کر جاتے ہیں۔ اور زبان میں خدا نے ایسی تاثیر دی کہ وہی باتیں ایک مضمون بن جاتی ہیں۔“

اس طرح ذوق کے بابت لکھتے ہیں۔

”کام کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ستارے آسمان سے اتارے ہیں مگر لفظوں کی ترکیب سے انھیں ایسی شان و شکوہ کی کرسیوں پر بٹھائے اس کے پہلے سے بھی اونچے نظر آتے ہیں انھیں قادر کلامی کے دربار سے ملک سخن پر حکومت مل گئی ہے ہر قسم کے خیال کو جس رنگ میں چاہتے ہیں کہہ جاتے ہیں۔“

ان تصاویر میں محض تاثراتی رائے۔ جانبداری اور مبالغہ آرائی ہے اورلفظکا بے دریغ استعمال کیا گیاہے ۔ اس لئے ڈاکٹر احسن فاروقی ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

” تنقید میں آزاد نے لفظوں کے طوطے بنا بناکراُڑائے ہیں۔“

ANS 05

علامہ شبلی نعمانی اردو تنقید کے ان بنیاد گزاروں میں سے ایک ہیں جن کو الطاف حسین حالی کے بعد اردو تنقید اور شعریات کے سب سے نمایاں نظریہ ساز نقاد کا نام دیا جا سکتا ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں تنقید ہمارے سامنے ایک مستحکم روپ میں ابھرتی ہے اور تذکروں کی تنقید (جس کو تنقیدی شعور کے آغاز کا نام دینا زیادہ مناسب ہو گا)۔ کے دائرۂ کار سے باہر نکلتی ہے۔ اس کا سہرا سب سے پہلے مولانا الطاف حسین حالی اور اس کے بعد علامہ شبلی نعمانی کے سر بندھتا ہے۔ حالی نے (1893) میں مقدمہ شعرو شاعری لکھ کر ادبی دنیا میں ہلچل پیدا کی۔ آج بھی ان کے وضع کر دہ اصولوں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جا تا ہے۔ اس کے بعد شبلی نے بیسویں صدی کے آغاز میں ہی تقابلی تنقید کا ایک اور نیا رخ موازنۂ ا نیس و دبیر (1907) لکھ کر پیش کیا۔ الطاف حسین حالی اور شبلی نعمانی سے قبل اگر کوئی نقاد اردو میں نمایاں نظر آتا ہے تو وہ محمد حسین آزاد ہیں مگر آزاد کو شعرائے اردو کے تذکروں کے بعد اردو تنقید کے باقاعدہ آغاز سے قبل ایک ایسے ادبی تاریخ نویس کا نام دیا جانا چاہیے جس نے تذکروں کی اصطلاحات سے آگے بڑھ کر بعض تنقیدی تصورات کی وضاحت کا فریضہ انجام دیا۔ چونکہ ان کا تنقیدی اسلوب زیادہ دو ٹوک نہیں اور ان کی تنقیدی زبان پر بھی انشا پردازی کا غلبہ نظر آتا ہے اس لیے ان کو حالی اور شبلی کی برابری کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ ان ہی کی طرح اس زمانے میں امداد امام اثر نے بھی جو تنقیدلکھی وہ بھی شبلی اور حالی کے دوٹوک انداز و اسلوب کا درجہ حاصل نہیں کر پائی۔شبلی نعمانی کی تنقید نگاری کا جائزہ لینے کی غرض سے تنقید کے بارے میں ان کی دو بنیادی کتابوں موازنۂ ا نیس و دبیراور شعر العجم کا ذکر نا گزیر ہے۔ موازنہ کے ذریعے شبلی نے تنقید کو محدود دائرے سے نکال کر مغرب کے بالمقابل کر دیا وہ

اس لیے کہ مغرب میں تو تقابلی تنقید کا چلن عام تھا مگر اردو میں تقابلی تنقید پر پہلی کتاب شبلی کی موازنۂ انیس و دبیر ہی سامنے آتی ہے۔اس کتاب کے منظر عام پر آتے ہی شبلی نے اپنی تنقیدی صلاحیتوں کا لوہا بھی منوالیا۔ مرثیہ نگاری کے دو بڑے اور نمائندہ فن کار انیس و دبیر کے درمیان موازنہ کر کے شبلی نے ادب کو ایک نیا نقطۂ نظر دیا۔ آج بھی شبلی کی یہ کتاب تنقیدی میدان میں استناد کا درجہ رکھتی ہے اور اہل علم انیس و دبیر کو موازنہ کے سیاق و سباق میں رکھ کر پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شعر العجم کی چوتھی جلد بھی ان کا تصورِ شعر، تنقیدی شعور اور اس کے علاوہ ادبی بصیرت قاری کو اپنی گرفت میں لیے بغیر نہیں رہتی۔ یوں تو شعر العجم کی پانچ جلدوں میں فارسی شاعری کی تاریخ ملتی ہے مگر چو تھی جلد کے پہلے حصہ میں تنقیدی اصول و نظریات سے بحث کی گئی ہے جو کہ نظری تنقید کے اعلیٰ نمونے قرار دیے جا سکتے ہیں۔ تنقید کے اصول و ضوابط ا ور نظریاتی مسائل کا اس طرح جائزہ لیا گیا ہے کہ وہ فارسی کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کی پرکھ اور محاسن کی شناخت کا وسیلہ بن جاتے ہیں شبلی کے یہاں مشرقی شعریات کا اثر گہرا دکھائی دیتا ہے۔ شبلی کی تنقیدی تصانیف کے ذریعے یہ بات سامنے آتی ہے کہ شعر و سخن کی پرکھ کے سلسلے میں بنیادی باتیں موازنہ میں موجود ہیں اور ان کی مزیدو ضاحت شعر العجم کی چوتھی جلد میں ملتی ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہو تا ہے کہ شعر العجم میں مو جود شعریات اور تنقیدی تصورات سے پہلے ہم موازنۂ ا نیس و دبیرکے مباحث پر ایک نگاہ ڈال لیں۔

جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ موازنہ میں انیس و دبیر کے شاعرانہ کمالات کو پیش کیا گیا ہے۔ اور ان کی ادبی قدرو قیمت متعین کر نے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کے بیشتر حصے میں انیس کی شاعرانہ خوبیوں پر تفصیلی بحث ملتی ہے۔ہر اعتبار سے دبیرکے مقابلے ا نیس کا مر تبہ بلند دکھا یا گیا ہے۔ اس لیے اس کتاب کے منظر عام پر آنے کے بعد مخالفت کا بازار گرم رہا اور شبلی پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ دبیر کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے۔ دیکھا جائے تو یہ بات کسی حد تک درست بھی ہے کہ انیس کے مقابلہ دبیر کے کلام کا تجزیہ اس کتاب میں کم ملتا ہے۔ مگر اس کے باوجود شبلی نے جگہ جگہ دبیر کی علمیت، قوت اختراع، اور مضمون آفرینی کا اعتراف بھی کیا ہے۔ اس کے علاوہ دبیر کے کلام میں تشبیہات و استعارات کی ندرت و جدت کا ذکر بھی ملتا ہے۔مگر شبلی چونکہ اپنا سارا زور فصاحت و بلاغت پر صرف کر دیتے ہیں اس لیے انیس کے مقابلے انھیں دبیر کا کلام قدرے پھیکا اور کم حیثیت نظر آتا ہے۔ موازنہ میں فصاحت کی تعریف بہت جامع اور منظم انداز میں کی گئی ہے۔ شبلی نے اس انداز سے فصاحت کی تعریف کی ہے کہ آوازوں کے ذریعے الفاظ کے فصیح اور غیر فصیح ہونے کا فرق ہمارے سامنے نمایاں ہوکر آجاتا ہے۔ اسی روشنی میں شبلی نے میر انیس اور مر زا دبیر کے کلام کو پرکھنے کی کوشش کی اور مثالوں کے ذریعے یہ صاف کر دیا کہ فصاحت کی عمدہ مثالیں میر انیس کے کلام میں کس طرح پائی جاتی ہیں۔ انھوں نے دونوں شاعروں کے مصرعوں یا شعروں کو سامنے رکھ کر یہ بات واضح کی ہے کہ انیس کا کلام دبیر کے مقابلے میں زیادہ فصیح معلوم ہو تا ہے۔مثال کے طور پر یہ مصرعے دیکھیے:

کس نے نہ دی انگو ٹھی رکوع وسجود میں

مرزادبیر

سائل کو کس نے دی ہے انگوٹھی نماز میں

میر انیس

شبلی فصاحت پر مزید بحث کر تے ہوئے لفظ کے فصیح ہونے کو کافی نہیں سمجھتے اور اس کی ترتیب و تناسب یاساخت و ہیئت پر زوور دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’کلام کی فصاحت میں صرف لفظ کا فصیح ہو نا کافی نہیں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ جن الفاظ کے ساتھ وہ ترکیب میں آئے ، ان کی ساخت، ہیئت، نشست، سبکی اور گرانی کے ساتھ اس کو خاص تناسب اور توازن ہو ورنہ فصاحت قائم نہ رہے گی‘‘۔

(موازنۂ انیس و دبیر، مر تبہ فضل امام،ص، 45)

شبلی نے فصاحت کے ضمن میں ترتیب و تناسب کو بھی اہمیت دی ہے۔ اس روشنی میں شبلی نے میر انیس کے کلام سے متعدد مثالیں پیش کی ہیں یہاں ایک دو مثال کا ذکرنا گزیر معلوم ہوتا ہے۔
کھا کھا کے او س اور بھی سبزہ ہرا ہوا
***
شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے
شبلی کا ماننا ہے کہ اوس اور شبنم دونوں لفظ فصیح ہیں لیکن اگر میر انیس اوس کے بجائے شبنم اور شبنم کی جگہ اوس کا لفظ استعمال کرتے تو فصاحت باقی نہیں رہتی۔ اس لیے لفظوں کے انتخاب میں تو ازن اور تناسب دیکھنا بے حد ضروری ہے۔ لفظوں میں معمولی الٹ پھیر کے ذریعے کلام میں جو فرق پیدا ہوتا ہے اسے ذیل میں دی جارہی مثال سے بہ آسانی سمجھا جا سکتاہے۔میر انیس نے حضرت علی اکبر کے اذان دینے کی تعریف اکثر جگہ کی ہے۔ ایک جگہ اس بات کو اس طرح ادا کرتے ہیں۔
تھا بلبل حق گو کہ چہکتا تھا چمن میں
ایک دوسرے موقع پر کہتے ہیں:
بلبل چہک رہا تھا ریاض رسول میں
دونوں مصرعوں کا مضمون ایک ہے مگر لفظوں کے الٹ پھیر نے واضح فرق پیدا کر دیا ہے۔ ان تمام مثالوں کے ذریعے شبلی کے وسیع مطالعہ باریک بینی اور ناقدانہ بصیرت کے سبب ہمیں قدم قدم پر ان کے گہرے تنقیدی شعور کا قائل ہو نا پڑتا ہے۔بلاغت پر بھی شبلی پر معنی انداز میں بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔بلاغت کے لیے ضروری ہے کہ کلام فصیح ہو۔عام طور پر یہ خیال تسلیم کیا جا تا ہے کہ جس کلام میں دوسروں تک پہنچنے کی جتنی صلاحیت ہو گی وہ اتنا ہی بلیغ ہوگا۔شبلی بلاغت کو اس طرح سمجھتے ہیں:
’’بلاغت کو الفاظ سے چنداں تعلق نہیں، محض مضامین کو بھی بلیغ یا غیر بلیغ کہا جا سکتاہے۔ بلاغت الفاظ در حقیقت بلاغت کا ابتدائی درجہ ہے۔ اصل اور اعلیٰ درجے کی بلاغت معانی کی بلاغت ہے۔‘‘
(موازنۂ انیس و دبیر، مر تبہ فضل امام ، ص59-60)
شبلی نے مثالوں کے ذریعے یہ ثابت کیاہے کہ الفاظ کی بلاغت سے زیادہ میر انیس کے یہاں معنی کی بلاغت ملتی ہے۔ جبکہ دبیر کے یہاں معانی کی بلاغت انیس کے مقابلے میں کم ہے۔ شبلی کا ماننا ہے کہ انیس کا اصل جوہر معانی کی بلاغت میں کھل کر سامنے آتا ہے۔ میر انیس اور دبیر کے کلام سے بلاغت کی مثال دیکھیے کربلا کے واقعات میں ایک موقع ایسا آتا ہے جب کوئی امام حسین کا نام اور تعارف جاننا چاہتا ہے۔ اس صوت حال کو دبیر اس طرح بیان کر تے ہیں کہ امام حسین کی زبان سے خود ستائی ظاہر ہوتی ہے:
فرمایا میں حسین علیہ السلام ہوں
اس مقابلے میں ایسی صورت حال کے بیان میں انیس کے یہاں انکسار اور عظمت دونوں موجود ہیں:
مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں
شبلی کا ماننا ہے کہ ان مصرعوں میں بلاغت کا جو نکتہ چھپا ہوا ہے اس کا اندازہ صرف مذاق سخن سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔شبلی موازنہ میں تشبیہ اور استعارے پر بھی مدلل انداز میں اپنی رائے پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں تشبیہ و استعارہ ایسے شاعرانہ وسائل ہیں جن کے ذریعے کلام کی دلکشی میں اضافہ ہو جا تاہے۔ شبلی بھی تشبیہ و استعارے کو کلام کا زیور سمجھتے تھے ان کا کہنا تھا کہ اگر کوئی چیز کلام میں یا تحریر میں روح پھونک سکتی ہے تووہ تشبیہات و استعارات ہیں۔ شبلی تشبیہ و استعارے کے حسن کے تبھی تک قائل ہیں جب تک وہ اپنی اصلی حالت میں قائم رہیں اور غیر ضروری معلوم نہ ہوں۔ تشبیہ کی اہمیت اور افادیت پر بحث کر تے ہوئے شبلی نے تشبیہ کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ ایک مفرد اور دوسری مرکب۔ شبلی کا ماننا ہے کہ مفرد تشبیہ میں جدت پیدا نہیں کی جا سکتی

جبکہ مرکب تشبیہ میں صورت حال کی مناسبت سے جدت پیدا کی جا سکتی ہے۔ مرکب تشبیہ میں جدت اور ندرت کا سارا انحصار قوت اختراع پر ہو تا ہے۔ انھوں نے ایک اور نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تشبیہ کی خوبی یہ ہے کہ مشبّہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے جیسا کہ عرب میں نیچرل قسم کی تشبیہات پائی جا تی تھیں۔ شبلی نے موازنہ میں یہ ثابت کیا ہے کہ میر انیس کے کلام میں تشبیہات کی جتنی خوبیاں پائی جاتی ہیں وہ کسی اور کے کلام میں ملنا مشکل ہے۔ تشبیہات کی ان خصوصیات کوشبلی نے متعدد مثالوں سے واضح کیا ہے۔ میدان کر بلا میں جب حضرت عباس پر چاروں طرف سے بر چھیاں چل رہی تھیں انیس نے اس کیفیت کو تشبیہ کے ذریعے نیا رنگ دے دیا ہے اور بر چھیوں کے چلنے کے ناپسندیدہ عمل کو کہیں سورج کی کر نوں اور کبھی پروانوں کی خوبصورت تشبیہات سے نمایاں کر نے کی کوشش کی ہے۔

یوں بر چھیاں تھیں چاروں طرف اس جناب کے
جیسے کرن نکلتی ہے گرد آفتاب کے
***

مقتل میں کیا ہجوم تھا اس نور عین پر
پروانے گر رہے تھے چراغ حسین پر

شبلی مزید لکھتے ہیں کہ محسوسات کے ذریعے جو تشبیہ دی جاتی ہے اس کی تصویر فوراً ذہن میں آجاتی ہے۔ اس قسم کی تشبیہات میر انیس کے کلام میں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ دو دشمنوں کے درمیان جب ایک دوسرے پر وار کرتے ہوئے ان کی بر چھیاں آپس میں ٹکرا رہی تھیں تو اس منظر کو میر انیس نے اس طرح بیان کیا ہے:

دو سانپ گتھ گئے تھے زبانیں نکال کے

شبلی شاعری میں حسن کاری کے قائل تھے۔ اس بات کو شبلی ایک بے حد خوبصورت مثال کے ذریعے بتاتے ہیں کہ اگر آدمیوں کے ہجوم کو اس طرح بیان کیا جائے کہ وہاں آدمیوں کا جنگل تھا تو کلام میں وسعت اور زور پیدا ہو جائے گا۔دیکھا جائے تو تشبیہ ایک عام خیال ہے جس کو کوئی بھی شخص اپنے کلام میں استعمال کر سکتا ہے۔ مگر جب تک تشبیہ میں ندرت اور کوئی خاص خوبی مو جود نہ ہووہ کوئی اثر پیدا نہیں کر سکتی۔ اس لیے شاعر کا فرض ہے کہ کلام میں نادر اور جدید تشبیہات اور استعارات استعمال کرے۔ جیسا کہ ہمارے یہاں کے اکثر بڑے شعرا نے کیا ہے۔ اگر بار بار وہی تشبیہیں اور استعارے استعمال کیے جائیں گے تو ان میں تازگی اور ندرت بر قرار نہیں رہے گی۔اس کے بعد شبلی صنائع و بدائع کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ صنائع و بدائع کے ذریعے کلام میں حسن اور دلکشی پیدا کی جا سکتی ہے۔ میر انیس کی شاعری جس زمانے میں پر وان چڑھی اس وقت مبالغہ، صنائع و بدائع، ایہام اور رعایت لفظی کو شاعرانہ کمال سمجھاجاتا تھا۔ ایسے میں میر انیس کا صنائع و بدائع سے الگ رہنا تھوڑا مشکل تھا۔ اس سلسلے میں شبلی کا خیال ہے کہ:

''باقی صنعتوں کو انھوں نے اس طرح برتا کہ کلام کی اصل خوبی یعنی برجستگی ،صفائی اور سادگی میں فرق نہ آنے پائے''۔(موازنہ انیس و دبیر ، مرتبہ فضل امام ،ص 99)

شبلی اس بحث کو مزید آگے بڑھا تے ہوئے کہتے ہیں کہ میر انیس کے کلام میں جن صنعتوں کا حسن و خوبی کے ساتھ استعمال ہوا ہے ان میں ایہام(یعنی ایک لفظ کے دو معنی مراد ہوں دوسرے معنی مراد نہ ہوں) مبالغہ، حسن تعلیل، مراعات النظیر(الفاظ کی رعایت) ہیں ویسے لف و نشرا ور تلمیح کے جابہ جا اشعار بھی میر انیس کے مرثیوں میں بکھرے نظر آتے ہیں۔ یہ تمام محاسن بلاغت کے ذیل میں آتے ہیں۔ اس کے بعد میر انیس نے اپنے کلام میں انسانی جذبات و احساسات، منظر نگاری، واقعہ نگاری کو بے حد خوبصورتی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ اس بات کوشبلی نے متعدد مثالوں سے واضح کیا ہے۔ ان مباحث کو نظر یاتی طور پر مستحکم کر نے کی غرض سے

شبلی نے جگہ جگہ مثالیں بھی دی ہیں۔لیکن انھوں نے محض نظر یاتی بحث پر اکتفا نہیں کیاہے، بلکہ عملی تنقید کر تے ہوئے میر انیس اور مرزا دبیر کی مر ثیہ نگاری کا تقابل اور موازنہ کیا ہے اور ہر جگہ ثبوت کے طور پر اشعار کے حوالے سے دونوں شاعروں کے فنی طریق کا ر کو بھی نمایاں کیا ہے۔

شعر العجم میں شاعری کے جن اصو ل و نظر یات کا ذکر ملتا ہے ان میں سے بیشتر کا ذکر موازنہ میں سر سری طور پر کیا جا چکا ہے۔ شعر العجم کی چوتھی جلد کے ابتدائی صفحات مین ان تمام مباحث پر تفصیلی گفتگو ملتی ہے۔ شبلی انشا پرداز تھے ، جمالیاتی ذوق رکھتے تھے۔ ان کی تحریروں میں کہیں کہیں رومانیت کا اثر بھی دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شبلی کی نثر روکھی پھیکی معلوم نہیں ہوتی بلکہ پیرایۂ بیان بہت شگفتہ اور دلکش انداز لیے رہتا ہے۔ اس لیے شبلی کو جمالیاتی نقاد کا نام دینا بھی غلط نہ ہو گا۔شبلی شاعری کوذوقی اور وجدانی چیز سمجھتے ہیں اس لیے ان کا یہ کہنا کہ چند الفاظ میں شاعری کا صحیح نقشہ پیش نہیں کیا جا سکتا درست معلوم ہوتاہے۔ شبلی نے شاعری میں دو چیزوں کو ضروری قرار دیا ہے۔ ایک ادراک اور دوسرا احساس۔ ادراک کا کام مسائل پر غور کرنا، نئی نئی ایجادات اور تحقیقات وغیرہ ہیں مگر احساس انسان کے دلوں پر گہرا اثر مرتب کر تا ہے۔ پھر چاہے وہ خوشی کی حالت ، غم کی حالت، یا حیرت انگیزی کا بیان ہو، یااس بات کو دوسرے لفظوں میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ احساس جب الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے تو شعر کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ چونکہ شعر میں کسی نہ کسی انسانی جذبے کا بیان کیا جا تا ہے اور وہ سننے والے کے دلوں پر گہرا اثر مرتب کر تا ہے اس لیے شبلی شعر کی تعریف ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں:

” جو کلام انسانی جذبات کو برانگیختہ کرے اور ان کو تحریک میں لائے وہ شعر ہے “۔

(شعر العجم ، جلد چہارم ، علامہ شبلی نعمانی ، ص4)

ان کا کہنا ہے کہ شاعری کی یہ وہ خصوصیت ہے جو اس کو تمام علوم و فنون اور سائنس سے الگ کر دیتی ہے۔ اس بات کی وضاحت کے لیے شبلی تاریخ اور شعر کے فرق، شاعری اور واقعہ نگاری کے فرق اور خطابت اور شاعری کے فرق کو بہت مدلل انداز میں مثالوں کے ذریعے واضح کر تے ہیں۔اس کے بعد شبلی اس بات پر توجہ مرکوز کر تے ہیں کہ شعر کے اصلی عناصر کیا ہیں؟ اور کن خوبیوں کی بنا پر اچھا شعر وجود میں آتا ہے؟ اس کے لیے شبلی نے دوچیزوں کو ضروری قرار دیا ہے۔ایک محاکات اور دوسرا تخیل ان میں سے کسی ایک صنعت کا استعمال شعر میں ہو گا تو وہ شعر کہلانے کا مستحق ہو گا۔ خیال بندی، بندش، طرز ادا، سادگی و سلاست کو شبلی شعر کے اصلی اجزاء تصور نہیں کرتے بلکہ ان کو ثانوی حیثیت دیتے ہیں۔اب ذرا یہ بھی دیکھ لینا چاہیے کہ شبلی نعمانی محاکات اور تخیل کی کیا تعریف کر تے ہیں اور شاعری میں اس کے استعمال کو کس طور پر کار آمد خیال کر تے ہیں۔ اس لیے محاکات اور تخیل سے متعلق شبلی کے ناقدانہ خیالات کا سرسری جائزہ پیش ہے۔کسی چیز یا کسی حالت کا منظر اس طرح بیان کر نا کہ اس کی تصویر آنکھوں میں گھوم جائے محاکات کہلائے گی۔ تصویر اور محاکات میں فرق واضح کر تے ہوئے شبلی کہتے ہیں کہ تصویر ہر جگہ محاکات کا ساتھ نہیں دے سکتی ہمارے گردو پیش میں بہت سارے حالات ،واقعات و اردات ایسی ہیں جو کہ تصویر کی مکمل پہنچ سے باہر ہیں۔ اس کے لیے شبلی نے عام مصوری اور شاعرانہ مصوری کے باریک اور لطیف فرق کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ یوں بیا ن کیاہے:

”ایک بڑا فرق عام مصوری اور شاعرانہ مصوری میں یہ ہے کہ تصویر کی اصلی خوبی یہ ہے کہ جس چیز کی تصویر کھینچی جائے اس کا ایک ایک خال و خط دکھا یا جائے۔ ورنہ تصویر ناتمام اور غیر مطابق ہو گی۔ بہ خلاف اس کے شاعرانہ مصوری میں یہ التزام ضروری نہیں شاعرا کثر صرف ان چیزوں کو لیتا ہے اور نمایاں کر تا ہے جن سے ہمارے جذبات پر اثر پڑتا ہے۔ باقی چیزوں کو وہ نظر انداز کر تا ہے یا ان کو دھندلا رکھتا ہے کہ اثر اندازی میں خلل نہ آئے۔“

(شعر العجم جلد چہارم ، علامہ شبلی نعمانی، ص10)

مصوری اور محاکات کے اس باریک فرق کو شبلی نے ایک شعر کے ذریعے پوری طرح صاف کر دیا ہے:

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا